Al Islam Message

الاسلام مشن کا ترجمان

زیر نگرانی

مولانا ارشد جمال

■ ■ ■ ■ ■

Al Islam message

Urdu quarterly literature

D.43/107-Bazar Sadanand.

Varanasi, U.P. (India) 221001

Mob: +91-9307324317

E-mail:aimvns@gmail.com

Free On-line only

January to March 2011

<<<<<<>>>>>>

اللہ کے نام سے	2
نبی کی ضرورت واہمیت	3
آزمائش کے طریقے	4
انسان گھاٹے میں ہے مگر	5
نیتوں کا کھیل	7
قرآن کی ایک آیت	8
دین آسان ہے	9
اسلام کے دائرے میں	10
ذکر وشکر	11
حضرت صفوان بن اُمَیّہ رضی اللہ عنہ	12
مسجدوں کی سیاحت	14

اللہ کے نام سے

اسلامی طریقہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی جائز کام شروع کیا جائے تو پہلے اللہ کا نام لیا جائے اور زبان سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے کلمات ادا کئے جائیں جس کا سیدھا سا معنی یہ ہوتا ہے کہ میں فلاں کام اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

بہت سارے لوگ محض اتنا جانتے ہیں کہ کام کے شروع میں بسم اللہ پڑھنی چاہیئے، لیکن بسم اللہ پڑھنے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کوئی رسم یا طریقہ ہے یا محض کوئی عادت ہے جسے بس نبھا دینا ہے، بلکہ بسم اللہ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے دل کی تمام گہرائیوں سے اور اعتقاد کی تمام توانائیوں سے اپنے پروردگار کی طرف توجہ کرے اور یہ یقین دل ودماغ میں بٹھا لے کہ میرا یہ کام جسے میں شروع کررہا ہوں اللہ کی مدد کے بغیر نہ تو شروع ہوسکتا ہے اور نہ اس کی مرضی کے بغیر پورا ہوسکتا ہے۔ اگر یہ یقین پیدا ہو جائے تو اِس یقین کے ساتھ ایک دوسرا یقین پیدا ہوگا وہ یہ ہے کہ جب میں اللہ کا نام لے کر کوئی کام انجام دوں گا تو پھر کوئی چیز نہ تو اُس کام کو نقصان پہنچا سکے گی اور نہ اُس کے پورا ہونے میں رکاوٹ بنے گی۔ یقین واعتماد کی اِسی طاقت کی بنیاد پر کبھی کبھی ایسا حیرت انگیز واقعہ بھی پیش آتا ہے جسے سن کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

لفظ اللہ؛ یہ اللہ کا ذاتی نام ہے۔ اِس کے علاوہ اُس کے بہت سارے صفاتی نام ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے: لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ...... اللہ ہی کے اچھے نام ہیں۔ مثلاً رحمٰن، رحیم، قادر، عزیز، جبّار، رزّاق، خالق اور مالک وغیرہ۔ کام شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھنے والے کو چاہیئے کہ اُس گھڑی اللہ کے اُسی نام کا تصور جمائے جو اس کام کی نوعیت کے مطابق ہو۔ مثلاً کوئی کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھے تو اُسے یہ تصور کرنا چاہیئے کہ میں اُس ذات کا نام لے کر کھانا شروع کررہا ہوں جو روزی دینے والا، بڑا ہی رزاق ہے۔ علم حاصل کرنے والا طالب علم بسم اللہ پڑھ کر سبق شروع کررہا ہو تو اُسے دھیان رکھنا چاہیئے کہ میں اُس ہستی کا نام لے کر سبق شروع کررہا ہوں جو علیم وخبیر ہے، علاّمُ الغیوب ہے اور سارے علم کی کنجی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے ہی ہر کام میں اُس کام کے مطابق اللہ کی صفت خاص کی طرف لَو لگائے تو وہ اپنے کام میں اللہ کی خاص رحمتوں اور انمول برکتوں کے جلوے دیکھے گا۔

نبی کی ضرورت واہمیت

انسان چاہے کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو، اُسے اللہ کی محبت کا دعویٰ ضرور رہتا ہے۔ وہ اپنے مذہب کے مطابق زندگی گذار کر سمجھتا ہے کہ وہ اللہ کی محبت کے قریب پہنچ رہا ہے اور بالآخر وہ اللہ کی محبت کو پالے گا اور اللہ بھی اُس سے محبت کرنے لگے گا۔ یہی دعویٰ یہودیوں اورعیسائیوں کوتھا۔ وہ کہتے تھے: ''ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اُس سے محبت کرنے والے ہیں''۔ مشرکینِ مکہ بھی اِسی گھمنڈ میں چور تھے۔ وہ کہا کرتے تھے: ''ہم اُن بتوں کی پوجا اِس لئے کرتے ہیں تا کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں''۔ لیکن اسلام نے محبت کے سارے دعویداروں کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ قرآن نے اعلان کیا: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران:۳۱)

اس آیت میں کہا گیا کہ اے اللہ کی محبت کا دَم بھرنے والو! اگر تمھیں اللہ کی محبت کا دعویٰ ہے تو پھر اللہ کے نبی ﷺ کی پیروی کرو تب کہیں اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اِس آیت کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو اُن حضرات سے متعلق ہے جو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے ہیں۔ قرآن اُن لوگوں کو بتاتا ہے کہ اللہ کی محبت کا راستہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی سے ملتا ہے۔ اِس راستے کو چھوڑ کر لوگ ہمیشہ ہی محبت الٰہی کی راہ میں بھٹک کر رہ گئے۔ جو لوگ اِس راستے پر چلے وہ محبت الٰہی کی منزل تک پہنچ کر رہے۔ اِسی راستے کا نام ''اسلام'' ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے گا کہ جس نے اسلام سے منہ پھیر لیا، وہ کبھی بھی اللہ کی محبت کو نہ پا سکا، کیونکہ اللہ کو اسلام کے علاوہ کوئی مذہب نہ پسند ہے اور نہ قبول۔

اِس آیت کا دوسرا پہلو اُن مسلمانوں کے حق میں جاتا ہے جو غیر ضروری باتوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں، جن کا رہن سہن سب مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ فرائض سے غافل ہیں اور نوافل میں ڈوبے ہوئے، اُس پر اللہ کی محبت کا دعویٰ! قرآن ایسے مسلمانوں کو بھی مخاطب کرتا ہے کہ جب تک تم لوگ اپنے نبی کو اپنا آئیڈیل نہ مان لوگے، پورے طور سے اُن کی پیروی نہ کرنے لگوگے؛ اُس وقت تک تم اللہ کی محبت نہیں پا سکتے۔ یہیں سے اللہ کے نبی ﷺ کی ضرورت اور اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ نبی کی ضرورت اِس لئے کہ اُن کی پیروی کے بغیر اللہ کی محبت نہیں مل سکتی اور اہمیت یہ کہ اُن کی پیروی کر کے ہم اللہ کے محبوب بندے بن سکتے ہیں۔

آزمائش کے طریقے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَيۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيۡنَ الَّذِيۡنَ اِذَا اَصَابَتۡهُمۡ مُصِيۡبَةٌ قَالُوۡآ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيۡهِ رَاجِعُوۡنَ ۔ (بقرہ:۱۵۵)

اور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف کے ذریعے، فاقہ کے ذریعے، مال جان اور پھلوں کا خسارہ کر کے اور صبر کرنے والوں کو جنت کی خوشخبری سنا دو جنہیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور ہم اُسی کی طرف پلٹنے والے ہیں۔

انسان کو اپنی زندگی میں نرم گرم ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی اُس کی زندگی آرام سے گذرتی ہے اور کبھی تکلیف سے۔ کبھی وہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتا اور کبھی غم سے نڈھال ہو جاتا ہے۔ جب انسان پر مصیبت آتی ہے اور اُس کا دل غم سے چور ہونے لگتا ہے تو اُس کا اثر اُس کی فکر اور سوچ پر پڑتا ہے جو بعد میں اس کی زبان سے لفظوں کی شکل میں نکلتا ہے۔ مصیبت کے مارے انسانوں کی سوچ دو طرح کی ہوتی ہے: ایک سوچ اُن لوگوں کی ہوتی ہے جن کی نظر ظاہری اسباب پر ہوتی ہے۔ مصیبت جس راستے سے اُن پر آتی ہے وہ اُسی کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ کسی آدمی کی وجہ سے وہ مصیبت میں پڑتے ہیں تو وہ اس سے گالی گلوج کرتے ہیں۔ کسی نامعلوم طریقے سے اُن پر مصیبت آتی ہے تو وہ اپنی قسمت کو کوستے ہیں یا اگر قدرتی طور پر مصیبت آتی ہے تو وہ اللہ ہی سے بیزاری کا اعلان کر دیتے ہیں اور دوسروں سے اللہ ہی کی شکایت کرتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ بے صبرے ہیں۔ انہیں اللہ کی معرفت نہیں ہوتی۔ یہ اپنے لئے جہنم کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔ دوسری سوچ اُن حضرات کی ہوتی ہے جو ہر مصیبت میں صبر کرتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ جب اللہ نے ہمیں پیدا کیا اور مرنے کے بعد دوبارہ اُسی کی طرف پلٹ کرنا جانا ہے اور زندگی کی باگ ڈور جب اُس کے ہاتھ میں ہے تو یہ شکوہ شکایت کیسی؟ ظاہری اسباب پر لعنت ملامت کرنا کیسا؟ وہ لوگ صبر کرتے ہیں اور ان کی زبان پر صرف ایک بول ہوتا ہے: بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور بے شک ہم اُسی کی طرف پلٹنے والے ہیں۔ ایسے صبر کرنے والوں کے لئے جنت کے دونوں پٹ کھول دیئے جاتے ہیں۔

انسان گھاٹے میں ہے مگر

انسان ذرا اپنے ماضی کے اوراق الٹ کر دیکھے اور اپنی گذری ہوئی زندگی پر نگاہ دوڑائے تو اسے پتہ چلے گا کہ اُس نے اب تک جو کچھ کیا وہ گھاٹے کا سودا تھا۔انسان جب کچھ کرنے دھرنے کے قابل ہوا اور اُسے کھانے کمانے کی سوجھ بوجھ ہوئی تو وہ روزی روٹی کی فکر میں گھر سے نکل پڑا۔ایک انسان اس روزی روٹی کے لئے کتنی مشقتیں اٹھاتا ہے،مغزماری کرتا ہے، اپنا خون جلاتا ہے، چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہاتا ہے تب جا کر وہ کچھ کماتا ہے اور جب کما چکتا ہے تو اپنی کمائی کا تھوڑا سا حصہ اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے باقی ساری کمائی وہ اپنے بال بچوں پر، اپنے ماں باپ پر اور اپنے ملنے جلنے والوں پر لٹا دیتا ہے۔جو بخیل ہوتا ہے وہ بچا بچا کر رکھتا ہے۔ کوئی اپنے خون پسینے کی گاڑھی کمائی چاہ کر بھی اپنے اوپر پورے طور سے خرچ نہیں کر پاتا۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُس کی دولت اُس کی زندگی ہی میں دوسرے کے زیادہ کام آتی ہے اور مرنے کے بعد اُس کی محنت کی کمائی ہوئی ساری جائیداد پر اُس کے بال بچوں کا اور اُس کے وارثوں کا قبضہ ہوتا ہے۔کیا انسان کی زندگی کا یہ کاروبار گھاٹے میں نہیں کہ زندگی بھر محنت تو اُس نے کی مگر اُس کی کمائی کا مزہ دوسروں نے لوٹا۔محل اُس نے تعمیر کیا لیکن وہ اُسے چھوڑ کر دنیا سے چلا گیا اور اب اُس پر دوسروں کا قبضہ ہے۔انسان نے جو کچھ اپنی زندگی میں بنایا تھا یا حاصل کیا تھا اُس کے بہت کم حصے سے اُس نے فائدہ اٹھایا اور تھوڑے دنوں تک وہ اُس کے استعمال میں رہا۔کیا اللہ نے انسان کو دنیا میں اِس لئے بھیجا تھا کہ وہ گھاٹے کا سودا کر کے چلا آئے؟ وہ اپنی زندگی کے کاروبار کو خسارے میں ڈال کر لوٹ آئے؟نہیں بلکہ اُسے دنیا میں بھرپور فائدے کی زندگی گذارنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔یوں تو انسان کی زندگی گھاٹے میں ہے،لیکن اگر وہ چاہے تو اپنی اس گھاٹے کی زندگی کو مکمل فائدے کی زندگی میں تبدیل کرسکتا ہے۔اس کا طریقہ کیا ہے اور کس راستے سے انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ قرآن خود بیان کرتا ہے: ﴿وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّاالَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ﴾ (عصر:۱-۳)

زمانے کی قسم! بے شک انسان بڑے گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیئے۔

بات یہ نہیں ہے کہ انسان نے دنیا میں کیا کمایا اور اُسے کتنا برتا اور کیا کچھ چھوڑا، بلکہ بات یہ ہے کہ وہ دنیا سے کیا اور کتنا اپنے ساتھ لے گیا؟ اگر ہم نے دنیا میں لمبا چوڑا بزنس کیا۔ اونچی اونچی بلڈنگیں بنوائیں اور بڑی بڑی کمپنیوں کے مالک بنے رہے مگر ہمارے پاس ایمان نہ تھا یا اگر تھا تو نیک عمل نہ تھا اور ہم دنیا سے خالی ہاتھ چلے تو ہماری یہ زندگی گھاٹے کی زندگی ہے۔ لیکن اس کے برعکس دنیا میں ہم دانہ دانہ کے محتاج تھے۔ فٹ پاتھ پر راتیں بسر ہوتی تھیں مگر جب ہم دنیا سے گئے تو ہمارے ساتھ ایمان بھی تھا اور نیک عمل بھی تو یہ زندگی مکمل فائدے کی زندگی رہی۔

نیک عمل سے صاحبِ ایمان بندے کی زندگی کو جو کچھ فائدے حاصل ہوتے ہیں اور اُس کی جتنی کچھ اہمیت ہے اُن سب کو قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:-

جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور نیک عمل کئے تو اُنھیں نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (مائدہ:٦٩)

جس مرد یا عورت نے نیک عمل کیا جبکہ وہ مومن ہوں تو ہم ضرور اُنھیں پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور اُنھیں اُن کے کئے کا اچھے سے اچھا بدلہ دیں گے۔ (نحل:٩٧)

تو جو شخص اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہے تو اُسے نیک عمل کرنا چاہئے اور وہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ (کہف:٨٨)

لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو جلد ہی وہ کامیاب لوگوں میں سے ہوگا۔ (قصص:٦٧)

اور جس مرد یا عورت نے نیک عمل کیا جبکہ وہ مومن ہوں تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اُنھیں جنت میں بے حساب رزق دیا جائے گا۔ (غافر:٤٠)

اور جو اللہ پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اللہ اُس کی برائیوں کو دُھل دے گا اور اُسے جنت میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں جاری ہیں جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہنے والے ہیں۔ (تغابن:٩)

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے، ہم اُنھیں ضرور نیک لوگوں میں جگہ دیں گے۔ (عنکبوت:٩)

نیتوں کا کھیل

اللہ کی بارگاہ میں نیتوں کا بڑا اعتبار ہے۔ اچھی نیت سے عمل مقبول ہوتا ہے اور بری نیت سے اچھا عمل بھی رَد ہو جاتا ہے۔ وہ جسم کو نہیں دل کو دیکھتا ہے۔ وہ صورت نہیں سیرت دیکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''بے شک اللہ نہ تمہارے جسموں کو دیکھے گا، نہ تمہاری صورتوں کو، وہ تو تمہارے دل اور عمل کو دیکھے گا۔ (مسلم) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچھی نیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گناہ کو نیکی سے بدل دیتا ہے۔ جیسے کسی نے گناہ کا ارادہ کیا مگر پھر اُسے [اللہ کے ڈر سے] چھوڑ دیا تو اب وہ ایک نیکی کا مستحق ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''بیشک اللہ نیکیوں اور گناہوں کو لکھتا ہے''۔ پھر اُس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا مگر اُسے کیا نہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے پاس اُسے ایک نیکی لکھے گا اور اگر اُس نے نیکی کا ارادہ کیا اور اُسے کر بھی لیا تو اللہ تعالیٰ اُس ایک نیکی کو سات سو گنا نیکی یا اُس سے بھی زیادہ نیکیاں لکھے گا اور اگر اُس نے گناہ کا ارادہ کیا مگر گناہ نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اپنے پاس اُسے پوری ایک نیکی لکھے گا اور اگر [ارادے کے بعد] گناہ کر بھی لیا تب اللہ اسے صرف ایک گناہ لکھے گا''۔ (متفق علیہ)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کوئی عمل نہیں کرتا مگر اُسے صرف اچھی نیت کی بنیاد پر عمل کا ثواب مل جاتا ہے۔ اس سلسلے میں دورِ نبوی کا ایک دلچسپ واقعہ ہے:

حضرت مَعْن ایک صحابیِ رسول ہیں۔ ان کے والد کا نام یزید ہے۔ یہ بھی صحابی رسول ہیں۔ ایک دن حضرت یزید نے صدقہ کرنے کے لئے سونے کے چند سکے لئے اور مسجد میں ایک شخص کے آگے رکھ گئے۔ اُدھر سے اُن کے صاحبزادے مَعْن آئے اور سکے اٹھا کر اپنے ساتھ لیتے گئے۔ جب وہ اپنے والد کے پاس پہنچے تو والد نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے تمہیں تو دینے کا ارادہ نہیں کیا تھا؟ اس بات پر دونوں آپس میں الجھ پڑے۔ تب وہ اپنا جھگڑا لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ نے ارشاد فرمایا: اے یزید تم کو تمہاری نیت کا اجر ملے گا اور اے معن تم نے جو کچھ اٹھا لیا وہ تمہارے لئے حلال ہے۔

صدقہ ادا بھی نہ ہوا مگر حضرت یزید کو اُس کا ثواب مل گیا، کیونکہ وہ صدقہ کی نیت کر چکے تھے اور اللہ کے ہاں نیتوں کا ہی اعتبار ہوتا ہے۔ [بخاری]

قرآن کی ایک آیت

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے ابتدائی حالات اچھے نہیں تھے۔ ڈکیٹی اور لوٹ پاٹ اُن کا مشغلہ تھا۔ وہ آنے جانے والے مسافروں اور راہگیروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اَبیوَرْد اور سَرخَس کے علاقوں میں اُن کی دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ اُنھیں ایک لڑکی سے عشق بھی تھا۔ ایک دفعہ وہ دیوار پھلانگ کر لڑکی سے ملنے جا رہے تھے کہ اچانک اُن کے کانوں میں کسی کے قرآن پڑھنے کی آواز پہنچی۔ اُس وقت وہ یہ آیت تلاوت کر رہا تھا:

﴿اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْااَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِاللّٰهِ﴾ [حدید:۱۶]

کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کے ذکر لئے لرز اٹھیں۔

اس آیت کو سن کر اُنھوں نے کہا: کیوں نہیں اے میرے پروردگار! وقت آ چکا ہے۔

پھر وہ اپنی معشوقہ سے ملے بغیر ہی لوٹ آئے اور رات گذارنے کے لئے کسی ویرانے میں پناہ لی۔ وہاں پہلے ہی سے راہگیروں کی ایک جماعت موجود تھی۔ اُن میں سے کوئی کہہ رہا تھا کہ یہاں رات بسر نہ کی جائے، بلکہ کوچ کر چلیں۔ کسی دوسرے کا کہنا تھا کہ صبح کے وقت یہاں سے نکلنا چاہئے کیوں کہ راستے میں فضیل کھڑا ہوگا، ہمیں پاتے ہی لوٹ لے گا۔ فضیل اُن کی باتیں سن کر فکر میں پڑ گئے اور خود کلامی کرتے ہوئے بولے: میں رات بھر گناہوں میں دوڑ دھوپ کرتا ہوں اور مسلمانوں کی ایک جماعت یہاں مجھ سے ڈری سہمی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اللہ نے مجھے اِن لوگوں کے پاس اِسی لئے پہنچایا ہے تا کہ میں اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤں اے اللہ! بلاشبہ میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں۔ [تاریخ مدینۃ دمشق:۳۸۲/۴۸-۳۸۳]

یہاں سے فضیل بن عیاض کے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ ان کو اِس نئی دنیا سے روشناس کرانے والا چونکہ قرآن تھا، اس لئے اُن کے دل میں قرآن کی بڑی عظمت تھی۔ وہ قرآن کی آیتیں سن کر بے تحاشا رونے لگتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ولایت کے مرتبے پر پہنچ گئے۔ یہ سب کچھ قرآن کی بس ایک آیت کی برکت تھی۔ آج بھی یہ آیت اُن مسلمانوں کو پکار رہی ہے جن کا دل اللہ کے خوف اور قرآن کی عظمت سے خالی ہے۔ اگر ہم ذرا کان لگا کر سنیں تو آج بھی یہ آیت دل کی دنیا میں بدل دینے میں پہلے جیسی تاثیر رکھتی ہے۔

دین آسان ہے

اسلام کی بہت ساری خصوصیتوں میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُس کے اندر آسانی کوملحوظ رکھا گیا ہے۔اُس کے احکام اور مسائل مشکل اور تنگ نہیں ہوتے جس طرح کہ دوسرے مذاہب میں شدت، تنگی اور حیرانی وپریشانی نظر آتی ہے۔اسلام میں کشادگی ہے اور آسانی ہے۔یہی اللہ کی مشیت کے مطابق ہے۔وہ فرماتا ہے:

﴿ يُرِيْدُاللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَايُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾[بقرہ:۱۸۵]

(اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور تمہارے ساتھ تنگی نہیں چاہتا۔)

دورِنبوی میں بھی جب کسی نے دین کے معاملے میں شدت اختیار کی اور دین کے کسی حکم کی اِس طرح پابندی شروع کی جس سے انسان تنگی اور مشقت میں پڑ جائے تو اللہ کے رسول ﷺ نے سختی کے ساتھ ایسی باتوں پر روک لگائی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین آدمی نبی ﷺ کے گھر آپ کی عبادت کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے آئے۔جب اُنھیں رسول اللہ ﷺ کی عبادت کا پتہ چلا تو اُنھوں نے سمجھا کہ آپ کی عبادت تھوڑی سی ہے۔وہ لوگ کہنے لگے کہ: کہاں ہم اور کہاں نبی ﷺ! آپ تو بخشے بخشائے ہیں[یعنی وہ تو معصوم ہیں اگر اُن کی عبادت تھوڑی سی ہے تو کیا حرج؟] تب اُن میں سے ایک بولا: میں تو ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا۔دوسرا بولا: میں تو ہمیشہ روزے سے رہوں گا اور افطار نہ کروں گا۔تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے دور رہوں گا اور شادی نہ کروں گا۔تو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آئے اور بولے: تمہی لوگ ہو جنھوں نے ایسا ایسا کہا ہے؟! لیکن میں اللہ کی قسم! تم سب سے زیادہ اللہ کا ڈر رکھتا ہوں اور تم سب سے زیادہ تقویٰ والا ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں، لہٰذا جس نے میری سنت سے منہ پھیرا وہ مجھ سے نہیں۔[بخاری ومسلم]

اِس حدیث سے مزاج ملتا ہے کہ کسی ایک عبادت میں اِس طرح لگ جانا کہ بہت سی دوسری عبادتیں اور دوسرے حقوق چھوٹ جائیں؛ ہرگز درست نہیں۔اِس سے آدمی رہبانیت (دنیا سے الگ تھلگ ہو جانا) کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اسلام میں رہبانیت نہیں۔

اسلام کے دائرے میں

ہر چیز کا ایک دائرہ ہوتا ہے۔ اگر چیز اپنے دائرے میں رہے گی تو محفوظ بھی ہوگی اور اُس کی قدر و قیمت بھی باقی رہے گی۔ اگر وہ اپنے دائرے سے باہر آ جائے تو ضائع بھی ہوگی اور عزت بھی جاتی رہے گی۔ یہی معاملہ ایمان والوں کا ہے۔ اگر ایمان والے چاہتے ہیں کہ وہ محفوظ رہیں اور اُن کی قدر و قیمت بھی باقی رہے تو اُنھیں اسلام کے دائرے میں مکمل طور سے داخل ہونا پڑے گا۔ جب تک وہ اسلام کے دائرے میں رہیں گے نہ ضائع ہوں گے اور نہ بے عزت۔

قرآن کہتا ہے: ﴿یَاأَیُّهَاالَّذِینَ آمَنُوْاادْخُلُوْافِی السِّلْمِ کَافَّةً وَّلَاتَتَّبِعُوْاخُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ اِنَّهٗ لَکُمْ عَدُوٌّمُّبِیْنٌ ﴾ (بقرہ:۲۰۸)......(اے ایمان والو! اسلام میں پورے طور سے داخل ہو جائے اور شیطان کے پیچھے پیچھے مت چلو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔)

اسلام میں پورے طور سے داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے کسی حکم کی نہ خلاف ورزی کرنا ہوگی اور نہ اس کے تقاضے کے خلاف قدم اٹھانا ہوگا۔ اپنی جان و مال اور عزت و قیمت کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو پورے طور پر اسلام کے حوالے کر دینا ہوگا۔ جس طرح بس کے مسافر کے لئے ضروری ہے کہ سفر کے دوران بس کے اندر بیٹھتے وقت نہ اپنا سر کھڑکی سے باہر کرے اور نہ اپنا ہاتھ، ورنہ دونوں کے ضائع ہو جانے اور شدید نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ اندیشہ صرف اس لئے پیدا ہوا کہ مسافر کے جسم کا بعض حصہ بس کے دائرے سے باہر نکل آیا۔ یونہی اسلام کی راہ پر چلنے والا صحت و سلامتی کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے تو اُسے اسلام کے دامن میں سمٹ آنا ہوگا۔

جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت چھوڑ بیٹھے گا، وہ شیطان کا پیروکار ہوگا۔ جو شخص اسلامی تعلیمات کے خلاف راستہ اختیار کرے گا وہ شیطان کا راستہ ہوگا اور جو شخص شیطان کے راستے پر چل پڑے گا، وہ اسلام کے دائرے سے باہر نکل آئے گا۔ اب شیطان چاہے اُسے ہلاک کرے یا بے عزت۔ اُسے نقصان پہنچائے یا اُس کی دولت سے کھیلے۔ ذرا سا موقع ملتے ہی شیطان اُسے دین ہی سے بیزار کر دینے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کا اور اسلام کے دائرے میں زندگی بسر کرنے والوں کا۔

ذکر و شکر

جو دل ذکر سے خالی ہے، وہ مردہ زمین ہے۔ جب اُس پر ذکر کی بارش ہوگی تو وہ لہلاتا ہوا سبزہ زار بن جائے گا، اس لئے اے ایمان والو! قرآن کی نصیحت سنو! اور اللہ کی یاد میں مصروف ہو جاؤ۔

قرآن کہتا ہے:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ • (بقرہ:۱۵۲)

لھذا مجھے یاد کرو میں تمھیں یاد کروں گا اور میرا شکرادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔

جو آدمی اللہ کو یاد کرتا ہے، وہ اُس کی شکر گذاری کرتا ہے اور جو اللہ کو یاد نہیں کرتا وہ اُس کی ناشکری اور نافرمانی کرتا ہے۔

جو ایمان والا اللہ کی یاد میں لگا رہتا ہے، وہ اللہ کے بہت بڑے فضل کا مستحق ہو جاتا ہے اور وہ اتنا فضل فرماتا ہے کہ بندہ سوچ بھی نہیں سکتا، چنانچہ بندہ جس حیثیت سے جہاں کہیں بھی اللہ کو یاد کرتا ہے، اللہ بھی اُسے اُس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اور بہتر مجلس میں یاد کرتا ہے۔

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان فرمایا کہ: اے ابن آدم! اگر تو مجھے اپنے من میں یاد کرے گا تو میں تجھے اپنے من میں یاد کروں گا اور اگر تو مجھے کسی مجمع میں یاد کرے گا تو میں اُس سے بہتر فرشتوں کے مجمع میں تجھے یاد کروں گا۔ اگر ایک بالشت میرے قریب آئے گا تو میں ایک ہاتھ تیرے قریب آؤں گا اگر تو ایک ہاتھ میرے قریب آئے گا تو میں کئی ہاتھ تیرے قریب آؤں گا اگر تو چل کر میرے پاس آئے تو میں دوڑ کر تیرے پاس آؤں گا''۔ (بخاری)

ذکر کا اِس سے بہتر صلہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

یادِ الٰہی میں گذر اوقات کرنے والے بندوں پر اللہ کا اتنا بڑا فضل!

یہ تو محبوبیت کا مقام ہے جو ایک بندہ ذکرِ الٰہی سے حاصل کر سکتا ہے۔

حضرت صفوان بن اُمَیّہ رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

جب مکہ فتح ہو گیا تو صفوان بن اُمیہ ''جدّہ'' روانہ ہو گئے تا کہ وہاں سے یمن چلے جائیں ۔عمیر بن وہب نے کہا: اے اللہ کے نبی! قوم کا سردار صفوان بن امیہ آپ کی وجہ سے بھاگ کھڑا ہوا ہے تا کہ وہ سمندر میں جا کر خودکشی کر لے۔لھٰذا آپ اسے امان دے دیں۔آپ پر اللہ کا درود ہو!

آپ نے فرمایا: اُسے امان ہے۔

اُنھوں نے کہا: آپ نشانی کے طور پر کوئی چیز دے دیں تا کہ وہ یقین کر لے کہ آپ نے امان دے دیا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا عمامہ دے دیا جسے پہن کر وہ مکے میں داخل ہوئے تھے۔ عمیر اُس عمامے کو لے کر نکلے۔صفوان کشتی میں سوار ہونا ہی چاہتے تھے کہ عمیر نے اُن کو جالیا۔

اُنھوں نے کہا: صفوان! میرے ماں باپ تم پر قربان! اللہ اللہ تم خودکشی کرنے کی سوچ رہے ہو! رسول اللہ ﷺ نے تمھیں امان دے دیا ہے۔ یہ رہا اس کا ثبوت۔

اُنھوں نے کہا: افسوس! دور ہو جاؤ مجھ سے بات مت کرو!

اُنھوں نے کہا: اے صفوان! میرے ماں باپ آپ پر قربان! وہ سب سے افضل ہیں۔ سب سے زیادہ بھلے ہیں۔سب سے زیادہ بردبار ہیں اور سب سے بہتر ہیں۔وہ تمہارے چچازاد بھائی ہیں ۔اُن کی عزت تمہاری عزت ہے ۔ان کی شرافت تمہاری شرافت ہے ۔ان کا ملک تمہارا ملک ہے۔

صفوان نے کہا: مجھے اپنی جان کا ڈر لگ رہا ہے۔

اُنھوں نے کہا: وہ بڑے سنجیدہ اور عزت دار ہیں۔

چنانچہ صفوان ان کے ساتھ لوٹ آئے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہو گئے۔

صفوان نے پوچھا: اِن [عمیر] کا کہنا ہے کہ آپ نے مجھے امان دے دیا ہے؟

آپ نے فرمایا: اُس نے سچ کہا۔

صفوان نے کہا: اگر ایسی بات ہے تو آپ مجھے مہلت دیجے۔

آپ نے فرمایا: تمھیں چار مہینے کی مہلت ہے۔
پھر صفوان بن امیہ اور عکرمہ بن ابوجہل دونوں ہی مسلمان ہو گئے۔

[سیرت ابن ہشام: ۶۶/۴-۶۷]

صفوان بن امیہ کو خودکشی کرنا گوارہ تھی لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں ذلت کی موت مرنا منظور نہ تھا۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ محمد ﷺ مجھے پکڑ کر جان سے مار ڈالیں گے۔ ویسے بھی میں نے اُن کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ مسلمانوں کو ستانے اور پریشان کرنے میں میں آگے آگے تھا۔ میری جاں بخشی کی کیا امید ہو سکتی ہے؟

اصل میں صفوان بن امیہ اپنے معیار پر سوچ رہے تھے۔ وہ اپنے جذبات کے ترازو پر رسول اللہ ﷺ کے کردار کو تول رہے تھے، مگر یہ وہ اللہ کا مقدس رسول تھا جس کے اخلاق کی برتری اور کردار کی عظمت کا اندازہ لگانا ذرا دشوار تھا۔ حضرت عمیر یہی بات اُن کو سمجھا رہے تھے جو بڑی مشکل سے ان کی سمجھ میں آئی۔ وہ کسی طرح یقین کرنے پر تیار ہی نہ تھے کہ محمد ﷺ مجھے چھوڑ دیں گے، لیکن جب بات واضح ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ نے واقعی اُنھیں چھوڑ دیا ہے تو وہ سوچ میں پڑ گئے کہ اب کیا کریں؟ اُنھوں نے آپ سے مزید سوچنے سمجھنے کی مہلت چاہی تو امید سے زیادہ اُنھیں مہلت مل گئی۔ بالآخر اُنھیں اعتراف کرنا پڑا کہ یہ رسول کسی کی جان کا دشمن نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور میری گردن بھی اُتار لیتا۔ وہ تو صرف توحید کو ماننے اور شرک سے باز آنے کی دعوت دے رہا ہے۔ اگر اس کے لئے کوئی اس سے لڑائی مول لے لے تو یہ خود اس کی ضد اور زیادتی ہوگی۔

صفوان بن اُمیہ کی سوچ کا رُخ تبدیل ہوگیا تو اُن کا دل بھی تبدیل ہوگیا۔ اُنھوں نے بہت کچھ سوچا سمجھا۔ رسول اللہ ﷺ کو قریب سے دیکھا اور مسلمان ہوگئے۔ وہ حالات کے دباؤ میں نہ تھے اور نہ کسی کے کہنے پر بہکے تھے بلکہ وہ خود اپنی رائے اور اپنی پسند سے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

مسجدوں کی سیاحت

25 ستمبر 2009 کو جب میں نے دہلی کا سفر کیا تو نماز کی غرض سے کئی بار جامع مسجد جانا ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی ہی حیرت ہوئی کہ مسجد کے صحن میں عورتوں، مردوں، لڑکے، لڑکیوں اور غیر ملکیوں کی ایک بھیڑ اکٹھا ہے، وہاں کوئی بھی جا سکتا ہے، کیونکہ اُسے tourist place قرار دے دیا گیا ہے۔ مسلمان مرد و عورت کا حال یہ تھا کہ اُنھیں یہ توفیق نہ ہوتی تھی کہ اُس عظیم الشان تاریخی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھ لیں۔ دور دراز کا سفر طے کر کے لوگ وہاں صرف اِس لئے آئے ہوئے تھے کہ جامع مسجد کی اُس عمارت میں جو تماشہ چھپا ہوا ہے، اُسے اپنے ماتھے کی آنکھوں سے صرف دیکھیں اور لذت حاصل کریں۔ عبرت کی نگاہ سے دیکھنے والے اِکّا دُکّا لوگ تھے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے جامع مسجد میں نماز پڑھنے کی توفیق بخشی تھی۔

جامع مسجد کی میناریں کافی بلند ہیں، اُن پر چڑھ کر دیکھنے سے پورے شہر کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ بلندی پر چڑھنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ جو جتنا نیچے ہوتا ہے اُسے اتنا کم نظر آتا ہے۔ ہر آدمی اپنی سطح سے دیکھتا ہے۔ یہی معاملہ علم اور فکر کا ہے۔ جس کا علم جتنا زیادہ اونچا ہوتا ہے اور جس کی فکر جتنی زیادہ بلند ہوتی ہے، وہ اتنا ہی اونچا سوچتا اور سمجھتا ہے۔ نہ وہ نیچی باتیں کرتا ہے اور نہ سطحی زندگی گزارتا ہے۔ آجکل بڑے بڑے علامہ اور مفکر بننے والے سطحیت پر آچکے ہیں۔ صحیح معنوں میں وہ علم و فکر کی نچلی سطح میں پڑے ہوئے ہیں۔

میں نے بھی اُس مینار پر چڑھنے کا ارادہ بنایا۔ میری گنتی کے مطابق یہ 120 زینے کا تھکا دینے والا عمل تھا۔ مینار کے آخری حصے پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ صرف دس بارہ مرد و عورت وہاں موجود تھے، جبکہ مسجد کے صحن میں سیکڑوں کی تعداد میں لوگ تفریح کر رہے تھے۔ بلندی تک پہنچنے کے لئے 120 زینے طے کرنے کی ہمت چاہئے۔ لوگ بہت آسانی سے short cut میں بلندی تک جانے کا مزاج رکھتے ہیں جو اِس دنیا کا معمول نہیں۔ زیادہ تر لوگ زندگی کو تفریح اور لذت کے طور پر لیتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہیں جو زندگی کو کسی اونچے مینار کی طرح بلند کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور زندگی کو ایک عبرتناک سفر سمجھتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ لوگ زینہ طے کرتے ہوئے ہانپ جاتے اور رُک رُک جاتے تھے،

مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے۔ اُن میں سے میں نے کسی کو نہیں پایا جو واپس لوٹ گیا ہو۔ لذت و سرور میں ڈوبے ہوئے معاشرے کو چھوڑ کر جو انسان آگے بڑھنے کا حوصلہ لے کر نکلتا ہے اور پورے ذوق وشوق اور اعتماد کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے، بہرحال وہ ہانپتے کانپتے مینار کی بلندی کو پا ہی لیتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ ایک شخص ہانپتا ہوا چلا آ رہا ہے، وہ آ کر میرے قریب ٹھہرا۔ میں نے اُس سے پوچھا: آپ نے کتنے زینے شمار کئے؟ اُس نے کہا: میں نے ساٹھ ستّر تک شمار کئے پھر بھول گیا۔ مجھے یاد آیا، زینہ طے کرنا ایک تھکا دینے والا عمل تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک مصیبت تھی اور مصیبت میں آدمی بہت کچھ بھول جاتا ہے اور اُس کا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

قیامت کے دن جب لوگ اُٹھیں گے تو سب کے سب مادرزاد برہنہ ہوں گے، لیکن کوئی کسی کے سَتر کو دیکھنے والا نہ ہوگا۔ قیامت کی مصیبت جو اِس کائنات کی سب سے بڑی مصیبت ہے، جب وہ انسانوں پر پڑے گی تو آنکھیں دیکھنا بھول جائیں گی اور ذہن سمجھنا چھوڑ چکا ہوگا۔

جامع مسجد مجھے پہلے سے زیادہ آباد نظر آئی۔ یہاں بہت زیادہ چہل پہل تھی۔ ہر طرف لوگ بکھرے پڑے تھے، لیکن حقیقی معنوں میں یہ مسجد ایک حد تک ویران ہو چکی تھی۔ مسجد کی آبادی یہ نہیں ہے کہ رنگ و روغن سے اُس کی رونق بڑھ گئی ہو، مرد وعورت کے اختلاط اور بچوں اور بڑوں کے اجتماع سے اُس کا حسن دُوبالا ہو گیا ہو اور وہ غیر ملکی سیّاحوں کی دلچسپی کا باعث ہو چکی ہو۔ مسجدیں تو اللہ کے ذکر سے، نماز اور تلاوتِ قرآن سے آباد ہوتی ہیں۔

''اللہ کی مسجدیں تو وہ آباد کرتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں اور جو نماز پڑھنے والے اور زکوٰۃ دینے والے ہیں اور جنھیں صرف اللہ کا ڈر ہے تو عنقریب وہ لوگ ہدایت یافتہ ثابت ہوں گے''۔ [توبہ:17.18]

مسجدیں بھلا اُن لوگوں سے کیسے آباد ہوں گی جو سیر سپاٹے کے لئے آئیں اور تماشا کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی نسلیں مسجدوں کو سیر وسیاحت کی جگہ سمجھیں، نہ کہ عبادت و تلاوت کی۔